جانشینِ امیر شریعت
حضرت مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حافظ عبدالرشید ارشدؒ*

حضرت مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری، حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ امیر شریعت بڑے ذکی اور مردم شناس تھے۔ ان کی اپنی زندگی تو ریل اور جیل میں کٹی لیکن اپنے بیٹے کی ذہانت وذکاوت کو دیکھتے ہوئے دینی تعلیم کے لیے خیر الاساتذہ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ عربی خیر المدارس جالندھر میں داخل کرایا۔ قرآن مجید تو پہلے ہی امرتسر میں حفظ کر لیا تھا اور دورۂ حدیث کے سال ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا۔ ان کا آخری تعلیمی سال تقسیم ملک کی نذر ہو گیا۔ مدرسہ خیر المدارس ملتان میں منتقل ہوا تو ۱۹۴۸ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ اپنے استاذ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کے نہایت چہیتے اور قابل فخر شاگردوں میں سے تھے۔ انہی کے حکم پر چند سال خیر المدارس میں پڑھاتے بھی رہے، استاذی حضرت مولانا محمد صدیق (شیخ الحدیث جامعہ خیر المدارس) آپ کے ہم جماعت اور دورہ حدیث کے ساتھی ہیں۔

یہ کہنا اور بتانا مشکل ہے کہ احقر نے سب سے پہلے حضرت ابوذر بخاریؒ کو کہاں دیکھا تھا۔ میں انتہائی کتب کے لیے ایک دفعہ ۱۹۴۹ء میں مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان میں داخل ہوا پھر درمیان میں میاں چنوں اپنے گھر آ کر حضرت مولانا محمد ابراہیم جگرانوی اور حضرت مولانا محمد عبداللہ دھرم کوٹی سے پڑھنے لگا۔ یہی وہ سال تھا کہ جب بھی مجھے موقع ملتا میں حضرت امیر شریعت کے در دولت پر حاضری دیتا۔ ظاہر ہے کہ انہی دنوں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہو گا۔ مرحوم کبھی کبھار اپنی مادر علمی خیر المدارس میں حاضری دیتے۔ کپڑے کی اونچی باڑ کی ٹوپی، شرعی شلوار کرتہ اور رنگ روپ سبحان اللہ..... مثالی مردانہ وجاہت کے حامل تھے۔ موٹی شربتی آنکھیں، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، رخسار سرخ وسپید اور پُر گوشت۔ میانہ قد، مائل بہ فربہی بلکہ فربہ ہی کہیے۔ دیکھتے طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ ان دنوں کسی مجلس میں ان کی گفتگو سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دور ہی سے درشن ہوتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی اپنے اساتذہ کے پاس مؤدب بیٹھے دیکھا کہ اُنہیں دیکھ کر پہلے دور کے استاد شاگرد کے رشتے کا احساس ہوتا تھا۔ چلتے ہوئے نگاہ سامنے نیچے رکھتے۔

نادیۃ الادب الاسلامی کا قیام اور علامہ طالوتؒ کی سرپرستی:

حضرت ابوذر بخاریؒ نے تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد ''نادیۃ الادب الاسلامی'' کی بنیاد رکھی۔ جس کے سرپرست علامہ طالوتؒ (مولانا عبدالرشید نسیم) تھے۔ جنہوں نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ اقبالؒ کے درمیان واسطہ بن کر ''نظریۂ قومیت'' پر خط کتابت کرائی تھی۔ یہیں ان کے متعلق یہ ذکر کر دیا جائے کہ علامہ طالوت بہت

* سابق مدیر ماہنامہ ''الرشید'' لاہور

بڑی علمی وادبی شخصیت تھے۔ان کی بعض نظمیں مولانا ظفر علی خان کے رنگ میں ''زمیندار'' میں قلمی نام سے شائع ہوئیں جو بعد میں مولانا ظفر علی خان کے مجموعہ کلام میں شائع ہوگئیں۔لیکن مرحوم قلندرانہ طبیعت کے مالک تھے،ان کی نشاندہی نہیں کی۔حضرت امیر شریعتؒ سے بہت ربط ضبط تھا۔حضرت شاہ صاحب کے مجموعۂ کلام ''سَوَاطِعُ الاِلْہَام'' کے شروع میں ان کا ایک بہت علمی مضمون ہے جس سے ان کی علمی وجاہت وثقاہت کا پتہ چلتا ہے۔میں نے ''بیس بڑے مسلمان'' میں حضرت شاہ صاحب پر مضمون لکھنے کی انہی سے درخواست کی تھی۔آپ اس کو لکھ رہے تھے کہ مجھے حرمین کی حاضری کا بلاوا آ گیا اور مجھے وہیں ان کی وفات کی اطلاع ملی۔اگر وہ زندہ رہتے اور ان کا مضمون شاملِ کتاب ہوتا تو بہت وقیع ہوتا لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا۔ان کی تاریخی حیثیت اس حوالے سے ہمیشہ رہے گی کہ انہوں نے برصغیر کی دو عبقری شخصیتوں کے درمیان واسطہ بن کر خط کتابت کی اور بڑھتے ہوئے معاملے کو سنبھال لیا۔گو،یار لوگ اب بھی اس کو گاہے ہوا دیتے رہتے ہیں۔

جملہ معترضہ طویل ہوگیا۔''نادیۃُ الادبُ الاسلامی'' کے علامہ طالوت مرحوم سرپرست تھے اور ہمارے ممدوح مرحوم مولانا سید ابوذر بخاری اس کے بانی تھے اور یہ وہ دور ہے کہ جب بڑے بڑے دانش ور ابھی منقار زیر پر تھے لیکن اس نوجوان بخاری سیّد نے کام کا آغاز کر دیا تھا۔اس مجلس کے زیر اہتمام کئی ایک کتابچے شائع ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اس نوجوان نے جو درس نظامی سے فارغ ہوا تھا،ملتان سے سہ ماہی ''مستقبل'' شائع کرنا شروع کیا۔جن لوگوں نے پاکستان بنایا تھا وہ اقتدار کی جنگ میں مصروف تھے اور جس کے محترم ومکرم والد نے تقسیمِ پاکستان سے نظریاتی اختلاف کیا تھا وہ پاکستان کے مستقبل کے لیے کام کا بیڑا اٹھا رہا تھا۔سی آئی ڈی کے کاغذات میں تو اب بھی شاید مجلس احرار اسلام اور اس کا نام لینے والوں کا نام بلیک لسٹ میں ہوگا۔ان دنوں تو پاکستان نیا نیا بنا تھا اور احرار اسلام کا نام لینا اپنے آپ کو گردن زدنی قرار دینا تھا۔تو پھر بانی احرار کے بیٹے کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملتان ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن کیوں دیتا۔

سردار عبدالرب نشتر سے ملاقات اور ''مستقبل'' کا ڈیکلریشن:

حضرت امیر شریعت کراچی تشریف لے گئے۔سید ابوذر بخاری بھی ساتھ تھے اور مولانا مجاہد الحسینی بھی،کہ بیٹے نے والد سے کہا کہ سردار عبدالرب نشتر وزیر اطلاعات ونشریات ہیں۔ان سے کہیے کہ مجھے ڈیکلریشن مل جائے۔حاجی مولا بخش سومرو کے گھر قیام تھا.....سومرو صاحب نے بھی کہا تو حضرت امیر شریعت آمادہ ہوگئے اور یوں کار میں بیٹھ کر کراچی کے سیکرٹریٹ کی طرف روانہ ہوئے۔حضرت امیر شریعت نے سردار صاحب کے نام اپنے نام کی چٹ بھیجی تو سردار صاحب پاؤں سے ننگے سر پر پگڑی رکھے فوراً باہر آئے اور مصافحہ،معانقہ کے بعد عرض کیا کہ مجھے چٹ بھیج کر اقامت گاہ پر بلا لیا ہوتا،تو امیر شریعت نے فرمایا کہ میں تو نہ آتا لیکن تمہارے بھتیجے کا اصرار تھا۔حاجی صاحب (مولا بخش سومرو) نے بھی کہا کہ جانے اور کہنے میں کیا حرج ہے؟اس پر سردار صاحب نے کہا کہ میں صوبائی حکومت یا متعلقہ دفتر کو کہہ دوں گا ان شاء اللہ کام ہوجائے گا۔

سردار نشتر مسلم لیگ کے ان سربرآوردہ زعما میں سے تھے جو اپنی خاندانی شرافت ونجابت اور ادبی ذوق کے لحاظ سے بہت نمایاں تھے۔عبوری حکومت میں انڈیا میں مسلم لیگ کی جانب سے وزیر رہے۔قیام پاکستان کے بعد پنجاب کے انگریز گورنر (سر فرانسس موڈی) کے بعد پنجاب کے پہلے مسلمان گورنر تھے اور مسلمانوں کے سابق حکمرانوں کی طرح وضع دار اور دیانت دار۔آپ کے لڑکے سائیکل پر سکول جایا کرتے اور سردار صاحب تقریباً باقاعدہ نیلا گنبد کی مسجد میں حضرت

مولانا مفتی محمد حسن امرتسری قدس سرہٗ کے ہاں جمعہ پڑھنے آتے لیکن بغیر کسی کرّ وفر اور سرکاری پروٹوکول کے۔ آپ کا انتقال شب جمعہ کو ہوا۔ اس جمعہ یا اگلے جمعہ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے جمعہ کی تقریر میں فرمایا کہ ان اوقات میں مرنے والوں کا بمصداق حدیث شریف، حساب کتاب نہیں ہوگا اور پھر اس کی مختلف توجیہات بیان فرمائیں اور آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شب جمعہ کو وفات ہی اس مسلمان کو دیتا ہے کہ جس کی کسی خوبی کی وجہ سے حساب کتاب لینا منظور نہ ہو۔ اور پھر اپنا ایک قصہ سنایا کہ میں جب دارالعلوم دیوبند میں طالب علم تھا تو شہرت ہوئی کہ ایک سن رسیدہ عورت مرض الموت میں ایک شعر پڑھ رہی ہے میں بھی اسے دیکھنے چلا گیا، دیکھا اور سنا تو وہ یہ شعر پڑھ رہی تھی:

خالی ہاتھ میں چلی دربار میں
کون پوچھے گا مجھے سرکار میں

میں نے یہ شعر سن کر پہلے مصرعہ کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے کو محمل بناتے ہوئے کہا کہ اس کا شبِ جمعہ کو انتقال ہوگا، تو صاحبو اس مستورہ کا انتقال شبِ جمعہ کو ہوا۔ میں نے اس کے دوسرے مصرعے سے تفاول لیا تھا اور اس حدیث شریف پر میری نظر گئی تھی۔ تو ہمیں اپنے اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ سردار صاحب کی موت شب جمعہ کو ہونے کے سبب ان کا قبر میں حساب کتاب نہیں ہوگا اور سردار مرحوم کے متعلق ویسے بھی مشہور ہے کہ نیک اور پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ میں میاں چنوں سے اگر لاہور آتا تو جمعہ شیرانوالہ گیٹ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے ہاں یا پھر نیلا گنبد میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں جمعہ کی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ لاہور کھلا ہوتا تھا اور چھوٹے شہروں کے لوگ عام طور پر جمعہ کو مال لینے آتے تھے کہ چھوٹے شہروں میں جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی۔ گزشتہ دنوں میں ایک کتاب سکندر مرزا کے متعلق پڑھ رہا تھا اس میں ان کے متعلق لکھا تھا کہ سکندر مرزا کے بقول:

> ''سردار اورنگزیب اب میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے وزارت سازی کے متعلق امداد کی درخواست کی تھی۔ میری نظر سردار عبدالرب نشتر پر تھی وہ ایک انتہا پسند مسلم تنظیم احرار کے راہنما تھے۔ احراری مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے اور بوجوہ کانگریس کے حلیف تھے۔ نشتر مسٹر جناح کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے گزشتہ سال ہی مسجد مہابت خاں میں ان کے خلاف ایک تند و تیز اور توہین آمیز تقریر کی تھی۔'' (سکندر مرزا، احمد سلیم۔ صفحہ:۶۹)

جب مسلم لیگ میں جنگ اقتدار اور زور پکڑ گئی تو کچھ دیر کے لیے سردار عبدالرب نشتر کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا تھا تو اس لحاظ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مجلس احرار اسلام کا ایک سابق سرحدی رکن ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ کی جانب سے بحیثیت مسلم لیگی وزیر، قیام پاکستان کے بعد مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات، پنجاب کا گورنر اور آل پاکستان مسلم لیگ کا صدر بھی بن گیا تھا۔ تو اس طرح اگر شاہ صاحب نے سردار عبدالرب نشتر سے ایک سفارش کی تو اپنے سابقہ احرار رضا کار سے سفارش کی۔

سرمایہ دار.....اور غریبوں کے حقوق کا تحفظ؟:

پاکستان میں مزدوروں کے متعلق بہت شور اور واویلا کیا جاتا ہے کہ غربت وافلاس زیادہ ہے۔ پاکستان کے مال دار ارب پتی سیاست دان ان غریبوں کا استحصال کر کے اپنی لیڈری چمکاتے آئے ہیں۔ جب کہ ان کو گرانی یا سٹیٹ بنک

کے زرمبادلہ میں کمی اور غیر ملکی قرضوں سے نہ کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ ان کے دھن دولت میں کوئی کمی ہوتی ہے۔ اور لوگ ہیں کہ ان کو بیساکھیوں کا کام دیتے ہیں۔ اسی نئی صورت حال میں دیکھئے مہنگائی اور گرانی کا سب سے زیادہ زر پرست پیر، دنیا دار علماء اور تاجر شور مچا رہے ہیں جن کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔ ان پجارو اور ہوائی جہاز میں سفر کرنے والوں کو کہ جن کی کوٹھیاں، دربار، ڈیرے، ایکڑوں میں ہیں کوئی تکلیف نہیں۔ اگر تکلیف ہے تو اپنی قیمتی موٹروں کو چھوڑ کر ویگنوں، بسوں یا ریل گاڑی کے نچلے درجے میں سفر کریں تا کہ پتہ چلے کہ غریب عوام کس بھاؤ تلے ہیں۔ ذخیرہ اندوز تاجروں کا سٹاک گوداموں میں پڑا پڑا سوگنا ہو گیا اور اکثر لیڈروں کا بینک بیلنس یا تو اپنے ہی ملک میں ڈالروں میں ہے یا پھر غیر ملکوں میں ان کے اکاؤنٹ ہیں جو از خود بڑھ گئے ہیں۔ سوال تو غریب کا ہے.....

میرا موضوع سخن غریب کی طرف اس طرح چلا گیا کہ میں جن افراد یا جماعت کا ذکر کر رہا ہوں، یہ برصغیر کی سب سے غریب جماعت تھی، جس کو آج کی سیاست کے اجارہ داروں کے بڑوں نے پنجاب میں آگے نہیں آنے دیا ورنہ ایک زمانہ آ گیا تھا کہ اس جماعت کی پنجاب میں وزارت بن جاتی۔ ان پر مسجد شہید گنج گرا دی گئی اور شہید گنج کے ملبے کے نیچے یہ لوگ اس طرح دب گئے کہ پھر اوپر اٹھ نہ سکے۔ سر فضل حسین نے شہید گنج گرنے یا گرانے کے بعد کہا تھا کہ میں نے احرار کے لیے ایسا گڑھا کھودا ہے کہ جس سے وہ قیامت تک نہیں نکل سکتے، لیکن اللہ کا اپنا ایک قانون ہے۔ اسی شہید گنج کے واقعے سے آغا شورش کاشمیری کو احرار میں لاملایا جو قیام پاکستان سے قبل اور بعد جب تک زندہ رہا حکمرانوں پر کابوس بن کر سوار رہا اور احرار آج بھی زندہ ہیں اور ان شاء اللہ زندہ رہیں گے۔

سہ روزہ ''مزدور'' کا اجراء:

ہمارے ممدوح حضرت مولانا ابوذر بخاریؒ نے ملتان ہی سے ''مزدور'' کے نام سے ایک سہ روزہ اخبار جاری کیا جو اگرچہ زیادہ دیر جاری نہ رہا لیکن نوجوان نے بتا دیا کہ ملک میں مزدور کے حامی اگر کوئی ہیں تو وہ احرار ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیٹا ہے جو ''مزدور'' اخبار نکال کر مزدور کی نمائندگی اور ترجمانی کرتا ہے۔ انھوں نے ''اسلام اور مزدور''، ''اسلام اور کسان'' کے عنوانات پر عوام کی رہنمائی کے لیے مضامین لکھے اور شائع کیے۔ مزدوروں کے حقوق کے لیے ''اسلامک ٹریڈ یونین'' اور کسانوں کے لیے ''اسلامی کسان کمیٹی'' بنائی۔ سرمایہ اور وسائل نہ ہوں، اشتہارات نہ ہوں اور بڑی بات یہ ہے کہ خود عوام اور غریب ہی اپنے حامیوں کے طرف دار نہ ہوں بلکہ جاگیر دار کے نعروں میں آ جائیں جو اپنی سیاست چمکانے کے لیے سرمائے کے بل بوتے پر پرکشش کھوکھلے نعرے لگائے تو ان کے مقابلے میں ایسا اخبار کتنی دیر چل سکتا ہے اور بمصداق.....ع۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

''مزدور'' توانا اور تناور درخت بننے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ لیکن ''مستقبل''، ''مزدور'' اور نادیۃ الادب الاسلامی سے بخاری سید زادے کے جوانی کے ارادوں اور امنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ ترقی پسند ادب، ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی یا اسلامی ادب بہت بعد کے نعرے ہیں۔ اس سید زادے نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا ہی مستقبل، مزدور اور نادیۃ الادب الاسلامی سے کی۔

صحیح تلفظ کا اہتمام:

حضرت سید ابوذر بخاریؒ تلفظ کا بہت ہی اہتمام کرتے۔ انہوں نے اردو کی عبارت لکھنے اور چھپوانے میں ایک خاص ذوق اور مزاج کو سامنے رکھا کہ عربی اور فارسی کے جو الفاظ اردو میں آتے ہیں ان پر ''اعراب'' زیر، زبر، پیش، شد

، مد، سکون کی علامت دی جائے کہ عام پڑھنے والے عربی اور اردو سے خاصے دور جارہے ہیں (اور اب تو بہت دور جا چکے ہیں) چند دن قبل ایک تقریب میں ایک صاحب ’’بدرجۂ اُتم‘‘ کو بدرجہ اُتّم کہہ رہے تھے۔ حالانکہ خاصے پڑھے لکھے ہیں۔ تو مرحوم نے اس طرز نگارش کی ابتدا کی تا کہ ہر کوئی الفاظ کو صحیح پڑھ سکے۔ مثلاً مُہتمم کو اس طرح لکھتے تھے اور ایسے ہَیمیّت کو زیر زبر سے واضح کر دیتے تھے۔ حُسام الدین لکھیں گے تو ح پر ضمہ یعنی پیش ضرور ڈالیں گے۔ افق عالم کو ’’اُفُق عالَم‘‘ مہیب کو ’’مُہیب‘‘ علیٰ ہذا القیاس اور دوسرے یہ کہ عربی میں جہاں کہیں تا (اردو میں ت) استعمال ہوتی ہے وہ گول ’’ۃ‘‘ استعمال ہوتی ہے۔ جب کہ اردو میں ’’ت‘‘ جیسے ’’جماعت‘‘ اور ’’رحمت‘‘ استعمال کرتے ہیں لیکن ابوذر بخاری مرحوم ’’جماعۃ‘‘ اور ’’رحمۃ‘‘ لکھتے اور چھپواتے تھے۔ ہاں اگر فارسی کا لفظ ہے تو وہاں اردو والی ’’ت‘‘ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً راست اقدام دست خط، لیکن یہ چلن ان کے اپنے اشاعتی کاموں میں رہا۔ کسی اور نے اس کو رواج دینے یا اختیار کرنے کی کوشش نہیں۔

میں کئی دفعہ اس کو کرنے کا اہتمام و داعیہ کرنے کے باوجود نہ کر سکا اور یہ بھاری پتھر نہ اٹھا سکا۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ خدا کرے کہ یہ تحریک عام ہو کہ ہمارے نوجوان جو ’’علما‘‘ کے انگریزی تلفظ پر ہنستے ہیں وہ خود عربی اور فارسی الفاظ کا درست تلفظ کر سکیں۔

حضرت مولانا سید ابوذر بخاریؒ ملک کے معدودے ان چند جیّد علماء میں سے تھے کہ جن کے علم کی گہرائی، گیرائی اتنی تھی کہ جس پر بجا طور پر کوئی قوم یا ملت ناز کر سکتی ہے۔ دین و دانش، فلسفہ و منطق، تاریخ و سیرت، انساب و سوانح، عروض و قوافی، نحو و صرف، عربی و فارسی اور علم و ادب پر اتنا گہرا عبور تھا کہ ان سے مل کر کسی بھی مسئلے پر کچھ دریافت کیا جائے تو ایک دبستان سا کھل جاتا۔ انہوں نے عربی اور فارسی کے طلباء کے لیے ’’**مجمع المصادر العربیہ**‘‘ اور ’’کان پارسی‘‘ تصنیف کیں۔ یہ اپنے موضوع پر منفرد کتابیں ہیں۔ کسی بھی عنوان و موضوع پر ان کا دماغ بند نہ تھا۔ لیکن افسوس کہ ان کی اس ذہانت و جودت طبع سے زمانہ کام نہ لے سکا۔

یومِ شہدائے بالاکوٹ کے جلسہ میں بے مثال تقریر:

اب صحیح سن یاد نہیں۔ انیس سو پچاس کے لگ بھگ کی بات ہے کہ عام خاص باغ ملتان کے ایک رات کے جلسے کی نشست میں انہوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کے موضوع پر تقریباً تین گھنٹے خطاب کیا۔ (ان دنوں مدرسہ عربی خیر المدارس؛ اب جامعہ خیر المدارس کے جلسے اسی باغ میں ہوا کرتے تھے) لیکن یہ جلسہ نادیۃ الادب الاسلامی کے زیرِ اہتمام ہوا تھا اور مولانا مجاہد الحسینی اس جلسہ کے سٹیج سیکرٹری تھے۔ تقریر کیا تھی علم و ادب اور خطاب کا ایک ایسا بحر ذخار تھا کہ جس کو سن کر ان کے عظیم والد امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ برصغیر کے سب سے بڑے خطیب، محاورے کی زبان میں انگشت بدنداں تھے اور اپنے نوجوان بیٹے کی اس علمی حیثیت و وجاہت کو دیکھ کر، سن کر خوشگوار حیرت میں مبتلا تھے۔ میں پوری تقریر میں باپ بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ چونکہ یہ تقریر بیٹے کی تھی لہٰذا باپ کے چہرے کی تمتماہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ اگر یہ تقریر ان کے فرزند دلبند کی نہ ہوتی تو حضرت شاہ صاحب تقریر کے بعد ایسے الفاظ میں تعریف کرتے کہ جن کی اپنی ایک شان ہوتی۔ پوری تقریر ہی آب زر سے لکھنے کے قابل تھی۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نے دو چار رسمی فقرے کہے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ’’در مدح پسر خود می گوید‘‘ اگر کسی اور کی تقریر ہوتی تو حضرت شاہ صاحب پورے ملک کی اپنی آئندہ تقریروں میں اس کی تعریف کرتے۔ بلکہ چھوٹا منہ بڑی بات، اپنے قیافے

کی بات کر رہا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب اپنی تقریروں میں اس کے حوالے دے کر مزید اپنے انداز میں تشریح کیا کرتے۔ وہ تقریر ایسی زوردار تھی کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ میری زندگی کی دو چار چند اہم سنی ہوئی علمی تقریروں میں سے ایک تھی۔ میں اب لکھنے کے وقت خیال کرتا ہوں کہ تحریک بالاکوٹ اور اس کے نامور قائدین وشہداء کے خون کی خوشبو سید زادے کو آ رہی تھی اور امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے علم وعمل اور اخلاص کی برکت اور اپنے مجاہد والد کی توجہ کام کر رہی تھی۔ اب اس جہاں میں باپ نہ بیٹا اور مجھے کسی کی خوشامد مطلوب ہے اور نہ اس کی ضرورت۔ بس اچانک لکھتے ہوئے کئی برس پہلے کے احساسات وتاثرات دل ودماغ سے نکل کر نوک قلم سے حوالۂ قرطاس ہو گئے۔

علم اور اس کے ساتھ عمل ان دونوں میں سے اپنے دامن میں کچھ نہیں ہے۔ اللہ کے نیک بندوں سے محبت ہے، وہ محبت قلم کو چلوا دیتی ہے اور میں لشتم پشتم کچھ نہ کچھ لکھ دیتا ہوں۔ احباب ان ٹیڑھی ترچھی لکیروں کو پڑھ لیتے ہیں۔ شاید کبھی کوئی لکھی ہوئی بات اللہ تعالیٰ کو منظور ہو جائے اور اپنا بیڑا پار ہو جائے۔ ویسے یہ عجیب بات ہے کہ آج کے مخدوم زادوں کے سبھی عظیم آباء سے نیاز مندانہ تعلقات تھے اور یہ میرے لیے فخر کی پونجی ہے کہ سبھی اکابر رحمہم اللہ نے اس حقیر کو اپنی شفقت سے محروم نہ کیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس گنہگار کو بس اتنی ہی نسبت رہی اور کچھ حاصل نہ کر سکا۔ اور یہ نسبت اگر کسی کام آ جائے تو وَ مَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز اور یہ اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ حضرت ابوذر بخاری سے بسا اوقات میں نے شیخ چلی کی طرح کسی اشاعتی منصوبہ کا ذکر کیا تو ہر دفعہ یہ فرمایا کہ دامے درمے سخنے ہر طرح تمہارے ساتھ ہوں۔ اس منصوبہ کا خاکہ تو ذہن میں ہمیشہ رہا لیکن عملی قدم اٹھانے کا موقعہ نہ مل سکا اور منصوبہ ابھی تک دل ودماغ سے نکلا نہیں۔ کیا عجب کہ زندگی کی کئی ایک آرزوؤں کی طرح یہ بھی عملی شکل اختیار کر لے یا اس کی ابتدا ہی ہو جائے۔ منہ سے نکلی ہوئی بات کو ٹھے چڑھ جائے۔

سید نفیس شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق ومحبت:

میں نے ''بیس بڑے مسلمان'' کی ترتیب کا آغاز ۱۹۶۲ء کے آخر میں کر دیا تھا اور میاں چنوں سے مکتبہ رشیدیہ کی جانب سے شائع ہونے والے مختلف کتابچوں میں اس کا اشتہار دینا شروع کر دیا تھا۔ جس سے اس کتاب کی شہرت ہونا شروع ہوئی لیکن یہ کتاب اپریل ۱۹۶۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے حوالے سے مجھے لوگ جاننے پہچاننے لگے۔ الحمدللہ یہ کتاب مقبول ہوئی۔ ایک غیر معروف اور گمنام شخص اب لاہور آ گیا تھا۔ اور یہاں زیادہ آمد ورفت حضرت سید نفیس رقم کے ہاں رہتی جو ۸۸، میکلوڈ روڈ ''چٹان'' بلڈنگ میں اپنا دفتر بنائے ہوئے تھے۔ یہاں آغا شورش کاشمیری اور حضرت سید نفیس رقم کی وجہ سے مختلف حضرات آتے۔ حضرت سید ابوذر بخاری بھی تشریف لائے ان کا قیام دہلی دروازے کے باہر دفتر مجلس احرار اسلام میں ہوتا۔ ان کی تشریف آوری ہمیشہ ہفتہ عشرہ کے لیے ہوتی اور اگر کبھی دفتر ہفت روزہ ''چٹان'' تشریف لاتے تو گھنٹوں نشست رہتی۔ ان مجالس سے مرحوم کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کا مزید علم ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ طویل نشستیں گویا چند منٹوں پر محیط ہیں۔ وقت گزرنے کا پتہ اس وقت چلتا جب سید نفیس شاہ صاحب کسی کو مخاطب کر کے اپنے مخصوص لہجے میں فرماتے کہ بھئی دیکھو نماز ظہر یا عصر کی اذان میں کتنا وقت رہ گیا۔ حضرت سید ابوذر بخاریؒ ایک جیّد عالم دین اور فقیہ تھے۔ قدیم وجدید علوم کا وسیع مطالعہ، علم مستحضر اور اس پر گہری نظر تھی۔ سید نفیس شاہ صاحب سے ان کے

تعلق کی مختلف وجوہات تھیں ایک تو حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ سے تعلق بیعت۔ دونوں پیر بھائی تھے اور حضرت رائے پوریؒ کے خلفا میں سے تھے۔ دوسرا فن خطاطی میں سید نفیس شاہ صاحب استاذ الاساتذہ کے مقام پر فائز تھے۔ ادھر سید ابوذر بخاری بھی فن خطاطی کے رموز واسرار سے نہ صرف واقف تھے بلکہ کسی زمانے میں بذاتِ خود بھی کتابت کرتے رہے۔ تیسرا سید نفیس شاہ صاحب کا ذوقِ مطالعہ، ان کی شرافت اور وضع داری۔ اگرچہ حضرت سید نفیس شاہ صاحب عالم دین نہیں تھے۔ ابتدائی عربی فارسی کی چند کتابیں پڑھیں اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی لیکن علماء ومشائخ کی صحبت نے وہ ذوق اور رنگ پیدا کیا کہ سبحان اللہ! حضرت سید ابوذر بخاری جب بھی تشریف لاتے تو حضرت سید نفیس شاہ صاحب کی کوشش ہوتی کہ وہ گفتگو کریں اور ہم استفادہ کریں۔ چنانچہ نفیس شاہ صاحب خود ہی سوالات کرتے اور حضرت سید ابوذر بخاری کی گفتگو شروع ہو جاتی۔ یہ مجالس کئی کئی گھنٹوں پر محیط ہوتیں۔ حضرت سید ابوذر بخاری نے مجلس احرار اسلام کی طرف سے شائع ہونے والے تقریباً تمام لٹریچر کے سرورق حضرت نفیس شاہ صاحب سے لکھوائے۔ وہ آتے تو کتابت کرانے کے لیے تھے لیکن نفیس شاہ صاحب اور ان کی بدولت سب حاضرین ان سے گھنٹوں استفادہ کرتے۔ تاریخ و سیرت، نسب، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوانحی حالات اور کارنامے ان سے سنتے اور سر دھنتے۔ دورانِ گفتگو کبھی شریکِ گفتگو کی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے اور کسی اجمال کی توضیح وتفہیم کے لیے نفیس شاہ صاحب کوئی مختصر سا سوال کرتے تو حضرت ابوذر بخاری بڑے تحمل سے اسے سنتے اور پھر اس موضوع پر معلومات ودلائل کے انبار لگا دیتے۔ ویسے بھی حضرت سید نفیس شاہ صاحب نہایت کم گو اور خاموش طبع تھے۔ وہ حضرت سید ابوذر بخاری صاحب کا بہت ادب واحترام کرتے اور اُن کے سامنے ہمیشہ مؤدب ہو کر بیٹھتے۔ حضرت سید نفیس شاہ صاحب، حضرت مولانا سید حامد میاں (بانی جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور) کے اصرار پر جامعہ مدنیہ آ گئے اور یہیں بیٹھ کر کتابت کرتے۔ حضرت مولانا سید ابوذر بخاری یہاں بھی تشریف لایا کرتے اور وہی گھنٹوں مجلس رہتی۔ حضرت نفیس شاہ صاحب تقریباً خاموش ہی رہتے۔ کوئی سوال یا تذکرہ چھیڑ کر ایک مضبوط سامع بن کر استفادہ کرتے اور حضرت مولانا سید ابوذر بخاری گفتگو فرماتے۔ آغا شورش کاشمیری بھی کتابت کرانے کے لیے یہاں کبھی کبھار تشریف لاتے تو مجلس کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ حضرت سید ابوذر بخاری کا دماغ لطائف و ظرائف اور واقعاتی حکایات کا خزانہ تھا۔ کبھی مسکراتے، قہقہہ لگاتے لیکن جب سنجیدہ علمی گفتگو فرماتے تو جس موضوع پر بھی گفتگو فرماتے، سیر حاصل تبصرہ فرماتے۔ بات علمی ہوتی یا سیاسی، کسی بھی فن پر ہوتی، تاریخ یا ادب پر، اکابر کے حالات و سوانح پر کوئی تشنگی باقی نہ رہتی۔ میدانی دریا کی طرح ہموار گفتگو ہوتی لیکن اگر کبھی سیاسی موضوع چھڑ جاتا تو پھر پہاڑی ندی نالوں کی طرح اتار چڑھاؤ ہوتا جن سے ہر کوئی محظوظ ہوتا۔

آنجہانی ظفر اللہ قادیانی کا بیان اور شورش کاشمیری کا جواب:

ایک دفعہ آنجہانی ظفر اللہ خان (قادیانی) نے ایک بیان میں کہا کہ ''عطاء اللہ شاہ بخاری مر گیا ہے۔'' گویا اب ہم کو زیادہ خطرہ نہیں۔ آغا شورش کاشمیری مرزائیت کے معاملے اور حضرت شاہ صاحب کے بارے میں بہت حسّاس تھے۔ آئندہ ''چٹان'' کے ٹائیٹل پر مولانا سید ابوذر بخاری کی پورے صفحہ پر تصویر شائع کی اور نیچے لکھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ''سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ ہے'' اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک مجلس احرار اسلام کے بانیان کی اولاد اور متبعین خصوصاً اور امت

مسلمہ عموماً زندہ و بیدار رہے اور مجلس احرار اسلام کی کوکھ سے نکلی ہوئی مجلس تحفظ ختم نبوت موجود ہے۔ مرزائیت کا تعاقب اور محاسبہ جاری رہے گا۔ کیا ہوا کہ مرزائیوں نے اپنی دولت کے بل بوتے پر سیٹلائیٹ کا انتظام کر کے اپنے غلط اور باطل خیالات کو پھیلانے کا انتظام کر رکھا ہے۔ الحمدللہ ختم نبوت کے پروانے کل بھی مفلوک الحال ہونے کے باوجود برطانیہ کے خود کاشتہ پودے (بقول مرزا غلام احمد قادیانی) کو جب کہ برطانوی استعمار کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا مقابلہ کرتے رہے اور اب جب کہ برطانیہ کی حکومت سمٹ سمٹا کر اپنے ملک یا دنیا کے کسی تھوڑے حصہ پر رہ گئی ہے تو یہ لوگ بھی مرغی کے بچوں کی طرح دوڑ کر برطانیہ کی چھتری یا پروں کے نیچے پناہ لیے ہوئے ہیں۔ مزا تو جب تھا کہ مرزا صاحب کے مدفن قادیان کی طرف رجوع کرتے۔ بہرحال اب پوری دنیا میں ان کا تعاقب ہوگا اور ہو رہا ہے۔ جہاں جہاں وہ جائیں گے، بخاری کے شیدائی وفدائی وہاں پہنچیں گے۔

مولانا سید عطاء المحسن بخاری کا کارنامہ:

۱۹۸۷ء میں دورۂ برطانیہ کے دوران کیمبرج یونیورسٹی میں ابنِ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری کی سرکردگی میں وہاں عرب طلبہ نے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ حضرت سید عطاء المحسن بخاری میری اور عرب طلباء کی درخواست پر اس جلسہ میں تشریف لائے جس کا اہتمام قادیانیوں نے کیا تھا۔ اُنھوں نے سامعین میں سے کھڑے ہو کر حجازی لحن میں قرآن کریم کی آیاتِ خاتم النبیین تلاوت کر کے کیمبرج یونیورسٹی میں مرزائیوں کا یہ جلسہ الٹ دیا تھا اور مرزائی سٹیج چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ عرب طلباء فرزندِ امیرِ شریعت کی تلاوت سُن کر اللہ اللہ پُکار کر داد دیتے رہے۔ پھر قادیانی مقرر کو "Go Back" (واپس جاؤ) کے نعرے لگا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بالکل اسی طرح ۱۹۱۶ء میں بندے ماترم ہال امرتسر میں مرزا بشیر الدین محمود کے جلسہ میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے سامعین میں سے اٹھ کر مرزا بشیر الدین کو حدیث غلط پڑھنے پر ٹوکا اور مرزا اسٹیج چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس کی تفصیل لندن کے ''اسلام آباد'' میں رہنے والے قادیانیوں کو خوب معلوم ہے۔ ''میں بھی حاضر تھا وہاں''۔ اُس روز مولانا سیّد عطاء المحسن بخاری کے حسنی و حسینی خون کی غیرت اور جرأت ایمانی دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلا

ہوا ہے گو تند و تیز، لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

دو بچھڑے دوستوں کی ملاقات:

تقریباً اکثر لوگوں کو ایسا موقعہ نصیب ہوتا ہے جب اپنے گاؤں، محلے یا سکول، کالج اور مدرسہ کے دوست سے سالوں بعد اچانک ملنا ہوتا ہے اس وقت فریقین کی مسرت دیدنی ہوتی ہے۔ جالندھر خیر المدارس میں چار پانچ طالب علم اکٹھے پڑھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ان میں سے ایک بہاول پور سے جامعہ ازہر اور وہاں سے برطانیہ برسوں رہ کر جناب مسعود کھدر پوش (اس وقت کے ناظم اعلیٰ اوقاف) سے مصر میں اور بعد میں برطانیہ میں متعارف ہوئے۔ مسعود کھدّر پوش ان صاحب (ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، سابق ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور) سے متاثر ہوئے اور ان کی محکمہ اوقاف میں بطور مشیر تعلیم و مطبوعات محکمہ اوقاف تقرری کر کے ان کو اطلاع دی اور ڈاکٹر صاحب لاہور آ گئے۔ دوسرے تمام

احباب مولانا سید ابوذر بخاری، مولانا عبدالمنان شاہد، مولانا گلزار احمد مظاہری، مولانا مجاہد الحسینی یہیں پاکستان میں تھے اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ رائے ونڈ کے اجتماع میں برادر محترم مولانا مجاہد الحسینی نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر رشید احمد صاحب فلاں محکمہ میں ہیں ان سے ملو۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا باہمی تعارف ہے۔ لیکن یہ تعارف یک طرفہ تھا یعنی ڈاکٹر صاحب کو جانتا تھا اور رائے پور کی تعلیم کے دوران ان سے ملا بھی تھا جب وہ دارالعلوم دیوبند سے گھر آئے تھے۔ میرے ذہن پر ان کی ذہانت کا نقش مرتسم تھا۔ بہرحال میں محکمہ اوقاف کے دفتر شاہ چراغ ہائیکورٹ ملنے گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے تو مجھے رسمی پوچھا کہ کیسے آئے؟ لیکن جب میں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں آپ کے گاؤں رائے پور میں پڑھتا رہا ہوں اور قریب کے ایک گاؤں ہری پور سے ہوں، تو بے تکلفی ہوگئی کہ ڈاکٹر صاحب بھی لاہور میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہے تھے اور غالباً سوائے حکیم محمد شریف جگرانوی کے کہ جن کے ساتھ دارالعلوم دیوبند پڑھتے رہے تھے کسی اور سے چنداں واقفیت نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرداً فرداً اپنے تمام احباب کے متعلق پوچھا۔ میں سب سے متعارف تھا۔ رائے پور کے دو تین خاندان میاں چنوں رہتے تھے۔ ان کا ذکر کیا اور یوں مستقل راہ ورسم ہوگئی۔

ایک دفعہ مولانا سید ابوذر بخاری لاہور تشریف لائے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔ کہ ان سے ملاقات کی شدید خواہش ہے۔ یہ ۷۰ء، ۷۱ء کی بات ہے لیکن ساتھ یہ کہا کہ ان کو میرا بتانا نہیں، مولانا ابوذر بخاری' سید نفیس شاہ صاحب کے پاس تشریف لائے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ کو مال روڈ گارڈینیا میں چائے پلانا ہے۔ پہلے تو انکار کرتے رہے کہ میں ایسی جگہوں سے چائے نہیں پیتا' پھر میرے اصرار پر مان گئے۔ وقت طے ہوگیا۔ میں ان کو ساتھ لے کر ''گارڈینیا'' گیا جو بعد میں ''سلاطین'' بنا اور آج کل وہاں کتابوں کی دکان ہے۔ ڈاکٹر صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے اُٹھ کر ملے۔ میں نے تعارف کرایا کہ یہ دوست برطانیہ سے تشریف لائے ہیں اور آپ سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ تو شاہ صاحب نے کہا کہ رازی صاحب ہیں؟ رازی پاکستانی میاں چنوں کے عزیز دوست برطانیہ میں رہتے تھے اور دو تین دفعہ ملتان حضرت امیر شریعتؒ کی زندگی میں حاضری کے لیے گئے تھے۔ ایک دفعہ میں بھی ساتھ تھا۔ شاہ صاحب یعنی ابوذر بخاری سے بھی ملاقات ہوئی لہٰذا شاہ صاحب کا ذہن ادھر گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے متعلق انہیں وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے خاص انداز اور تکیہ کلام میں کہا کہ: ''حد ہوگئی شاہ صاحب! آپ نے مجھے پہچانا نہیں''۔ اس پر شاہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو بغور دیکھا اور رشید احمد ہو' کہہ کر ملاقات کے لیے اٹھے، معانقہ، مصافحہ ہوا اور وفور جذبات سے آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے اور شاہ صاحب نے کہا کہ اب میں نے آپ کی کشادہ پیشانی اور اس پر ہلکے تبسم کو دیکھا تو فوراً جالندھر کی یاد آ گئی۔ یہ نشست بڑی طویل رہی اور پھر دوبارہ ملاقات کے وعدہ پر ختم ہوئی۔ کچھ عرصے بعد شاہ صاحب دوبارہ لاہور تشریف لائے تو ڈاکٹر صاحب نے شادمان اپنی قیام گاہ پر پُرتکلف دعوت دی۔ دو ایک دوستوں نے کھانا پکایا اور یہ نشست بھی گھنٹوں پر محیط تھی۔ اور شاہ صاحب نے کچھ دیر آرام بھی کیا..... دونوں دوستوں کی یہ ملاقات تقریباً ۲۳ سال بعد ہوئی تھی۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

طالب علمانہ زندگی عجیب وغریب اور اس کی یادیں بہت سہانی ہوتی ہیں اور سکول و مدرسہ کے دوست ساری عمر

یاد رہتے ہیں۔ یہ بہت خوبصورت اور یادگار ملاقات تھی۔ اس کے بعد ملتان ان حضرات کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ڈاکٹر صاحب ملتان اپنے ایک دوسرے ہم جماعت دوست چودھری محمد سلیم جو ہمارے علاقے کے بہت دین دار (اے ڈی آئی آف سکولز) چودھری عبدالخالق صاحب رحمہ اللہ (خلیفہ مجاز حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ) کے لڑکے ہیں ان کے پاس ملتان جا کر ان کو لے کر شاہ صاحب سے ملتے رہے۔

بادشاہی مسجد لاہور کا تاریخی جلسہ:

۱۹۷۴ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت چلی۔ جس کے نتیجے میں مرزائیوں کو پارلیمنٹ میں خاصے بحث ومباحثے کے بعد ۷ ستمبر کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔ اس فیصلے سے پہلے مجلس عمل کا لاہور بادشاہی مسجد میں یکم ستمبر کو جلسہ ہوا، جس میں تقریباً تمام دینی جماعتوں کے سربراہوں اور اہم زعما نے حصہ لیا۔ شاہی مسجد میں اتنا بڑا مذہبی جلسہ میں نے نہیں دیکھا۔ مسجد کے دالان کے آگے بلند سٹیج تھا اور تمام قائدین کے لیے آنے کا راستہ شاہی مسجد کے جنوب مغربی دروازے سے تھا جو برآمدے سے ہو کر دالان میں آتا تھا۔ مجلس عمل کے صدر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ جو ہمارے جانے سے پہلے آ چکے تھے۔ یا پھر ان کے آنے کا ہمیں علم نہ ہوا کہ ہم سٹیج سے بہت دور تالاب کے ساتھ بیٹھے تھے جلسہ کا آغاز کافی دیر سے ہو چکا تھا۔ مختلف حضرات تقریریں کر چکے تھے کہ مولانا سید ابوذر بخاری کی تقریر کا اعلان ہوا۔ سید ابوذر بحیثیت صدر مجلس احرار اسلام، مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے ایک اہم رہنما تھے۔ اتنے میں مسجد کے باہر اچھے خاصے گولے چلے یہ آواز بندوق، رائفل کے مشابہ تھی۔ بہت سے لوگوں کو اشتباہ ہوا کہ شاید باہر جنوب مغربی دروازے کے ساتھ گولی چل گئی ہے اور کوئی فساد یا پولیس سے تصادم ہو گیا ہے۔ تحریک ایسے موڑ پر پہنچ گئی تھی کہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایسے حالات میں سامعین میں سکون نہیں رہتا اور لوگ گردنیں اٹھا کر یا کھڑے ہو کر دیکھنے لگ جاتے ہیں اور صورت حال جیسا کہ عرض کیا مولانا سید ابوذر بخاری خطبہ کا آغاز کر چکے تھے۔ اس ہڑبونگ سے وہ خاموش ہو گئے یا شاید بیٹھ گئے ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ پتہ چلا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی آئے ہیں۔ جب کہ اس سے قبل ایسا نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوتا تو صدر مجلس عمل مولانا سید محمد یوسف بنوری کی آمد پر ہوتا..... پھر سکون ہو گیا اور مولانا سید ابوذر بخاری سے انتظامیہ نے کہا کہ آپ تقریر شروع کریں وہ مان نہیں رہے تھے کہ جلسہ میں سب مقررین کی حیثیت بطور نمائندۂ جماعت برابر تھی اور پھر مولانا ابوذر بخاری تو امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے جانشین تھے کہ جن کی مساعی سے مجلس احرار اسلام کے قیام سے قبل ہی سے مرزائیت کا تعاقب جاری تھا۔ گویا مولانا سید محمد یوسف بنوری صدر مجلس عمل کے بعد اگر کسی کی حیثیت امتیازی تھی تو وہ جانشینِ امیر شریعت کی تھی کہ جن کے والد کو محدث العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری نے شیرانوالہ باغ میں انجمن خدام الدین لاہور کے جلسے میں سیکڑوں علماء کی موجودگی میں مرزائیت کے خلاف مزید نمایاں کام کرنے کے لیے امیر شریعت قرار دے کر پہلے بیعت کی اور پھر سیکڑوں علماء نے۔ مولانا بنوری نے لکھا ہے کہ وہ بھی بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔ مولانا سید محمد یوسف بنوری انہی محدث کشمیری کے جانشین اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے ان دنوں امیر اور اپنی علمی وجاہت کی بنا پر مجلس عمل کے امیر تھے۔ مجلس احرار اسلام کے یکے از بانیاں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، قیام پاکستان کے بعد مجلس احرار اسلام کے ساتھ ساتھ مجلس تحفظ ختم نبوت قائم کر کے اس کے پہلے امیر بنائے گئے اور آج اسی کے امیر مولانا سید محمد یوسف بنوری تھے۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ ۱۹۵۳ء کی ختم نبوت کی تحریک میں

جماعت اسلامی نے کیا کردار ادا کیا تھا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے انکوائری کمیشن کے سامنے کیا بیان دیا تھا۔ انکوائری کی یہ تفصیل طویل بھی ہے اور افسوس ناک بھی۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ لاہور میں مارشل لا لگنے کے دوران ایک پمفلٹ لکھنے کی پاداش میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو مارشل لا حکام نے سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ اس کی تفصیلات احرار رہنما ماسٹر تاج الدین انصاری کے مطبوعہ پمفلٹ ''بیانِ صادق'' میں یا برادرِ محترم مولانا مجاہد الحسینی کے طویل مضمون جو اُنھوں نے ہفت روزہ خدام الدین لاہور میں قسط وار شائع کیا، میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم ذکر آنے پر یہاں مولانا سید ابوذر بخاری ہی کی ایک تحریر نقل کرتا ہوں جو انہوں نے چودھری افضل حق کی تحریر کردہ ''تاریخ احرار'' کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۶۸ء کے شروع میں طویل مقدمۂ کلمات کے ذیل میں لکھی تھی:

''اس جماعت (جماعت اسلامی) نے ۱۹۵۳ء کے مدّ وجزر پر موقع پرستانہ نگاہ رکھی، بشرط کامیابی ساتھ ہونے کا دعویٰ رکھنے اور بصورتِ ناکامی..... اپنی اختلافی رائے کو دلیلِ فرار بنانے کی دوغلی پالیسی اپنائے رکھی۔'' (تاریخ احرار، صفحہ ۱۴)

مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ اس جلسے کے روح رواں سید ابوذر بخاری کی تقریر اس تاریخی جلسہ میں نہ ہو سکی جو مختصر ہونے کے باوجود تاریخی ہوتی..... جب لوگوں کے نعروں کا شور کم ہوا اور جیسا کہ عرض کیا مولانا سید ابوذر سے کہا گیا اب تقریر فرمائیں لیکن وہ مان نہیں رہے تھے۔ سٹیج پر سربرآوردہ حضرات کے اصرار پر مولانا سید ابوذر بخاری نے دوبارہ تقریر شروع تو اب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سٹیج کے قریب پہنچ چکے تھے اس پر اسلامی جمعیت طلباء کے کارکنوں نے پھر سیدی مرشدی، مودودی، مودودی، جیوے جیوے، پیر مودودی کے نعرے شروع کر دیئے جو تقریباً نصف گھنٹہ تک جاری رہے۔ سید ابوذر بخاری سٹیج پر ہی بیٹھ گئے اور آخر وقت تک بیٹھے رہے۔ اسی شور وغل میں دو تین مقررین نے تقریریں کیں لیکن ہنگامے کی نذر ہو گئیں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر اور سید مظفر علی شمسی سٹیج سیکرٹری تھے، وہ اپنی گرج دار آواز اور پوری کوشش کے باوجود تقریباً ایک گھنٹہ تک سامعین کو خاموش رہنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ پھر سید مودودی کی باری آئی اور ان کا نام پکارا گیا۔ آج کے مقرر خصوصی مولانا مفتی محمود کی آمد ابھی باقی تھی۔ نوجوان خون ہر جماعت کے کارکنوں کا ایک جیسا ہوتا ہے اور وہ جذبات سے مشتعل ہو کر ایک جیسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ جمعیۃ علما اسلام اور مجلس احرار اسلام کے کارکن مولانا سید ابوذر کی تقریر کے وقت دیکھ چکے تھے کہ کیا ہوا۔ لہٰذا جیسے اسلامی جمعیت طلبہ کے ارکان نے کیا تھا، اس سے سوا مولانا مفتی محمود کے مدّاحین نے کیا۔ مفتی صاحب کو تو یہ نہیں پتہ تھا کہ اصل راستہ آنے کا کون سا ہے، باہر کھڑے منتظر نوجوان ان کو مسجد کے صدر دروازے سے اندر لے آئے۔ اب درمیان میں سٹیج تک کوئی راستہ تو تھا نہیں۔ لوگوں کے جم غفیر کے درمیان میں سے گزرے تو لوگ کھڑے ہو گئے اور راستہ دینے لگے۔ مولانا مودودی تقریر شروع کر چکے تھے اور لکھی ہوئی تقریر پڑھ رہے تھے۔ لیکن اس شور وغل میں تقریر کرنا ممکن نہ تھا اور پھر ایسے شخص کے لیے کہ جس نے قبرستان ایسے سناٹے میں تقریریں کی ہوں کہ جماعت کے جلسوں میں کوئی اونچا سانس بھی نہ لیتا تھا اور کھانسی کو بھی روکتا تھا۔ یہاں یہ حالت ہوئی تو چند منٹ بعد مولانا نے تقریر بند کر دی اور اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوان جو اس صورت حال کو پیدا کرنے کے باعث بنے تھے انہوں نے اب اسے اپنے لیڈر کی توہین سمجھا اور مفتی محمود صاحب کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہا، اس پر مزید شور مچا۔ اب یہ لوگ ہوش وحواس پر قابو نہ رکھ سکے اور بعض شر پسندوں نے جو ایسے واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں سٹیج پر چڑھ کر مفتی محمود صاحب کی طرف جوتے پھینکنے شروع کر دیے۔ میں سمجھتا ہوں

کہ کوئی بھی گیا گزرا مسلمان ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔ یہ یقیناً کسی خاص گروہ کے آدمی تھے۔ مفتی محمود اب سٹیج کے ساتھ تھے ان کو ہاتھوں سے کھینچ کر سٹیج پر چڑھایا گیا۔ جب شر پسندوں نے دیکھا کہ مفتی صاحب سٹیج پر پہنچ چکے ہیں تو ان شر پسندوں نے آخری راؤنڈ کھیلنا چاہا لیکن اس وقت سٹیج پر موجود احرار، خاکسار اور جمعیت علما اسلام کے رضا کار نوجوانوں نے یکجان ہو کر شر پسند ٹولے کو جنوب مغربی دروازے تک لے جا کر کچھ پٹائی کی۔ اس دوران عوام میں سے لوگ مسجد سے نکلنا شروع ہو گئے۔ اس نامناسب رویہ سے لوگ ادھر ادھر ہوئے تو لاؤڈ سپیکر کا نظام ہل گیا اور سپیکروں سے آواز آنا بند ہو گئی۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر اور مظفر علی شمسی کی گرج دار آوازوں نے مجمع کو بیٹھنے اور سکون سے جلسہ سننے کی بار بار اپیل کی۔ اس شب آغا شورش کاشمیری نجانے کہاں تھے۔ شاید علیل تھے ورنہ چند منٹ میں سارے ہنگامے پر قابو پا لیتے۔ اب کچھ مائیک کا نظام درست ہوا اور مفتی صاحب کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ اس پر پھر شر پسند لوگ جنوب مغربی دروازے سے نعرے لگانے لگے لیکن کچھ نہ ہو سکا اور مفتی صاحب نے اپنے زندگی بھر کے معمول کے خلاف زوردار الفاظ میں تقریر کا آغاز کیا اور کہا کہ ''یہ کون لوگ ہیں جو مجلس عمل تحفظ نبوت کے جلسہ کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ اپنی اوقات میں رہیں۔ ہم تو وقت کے آمروں کے خلاف کہ جن کے پاس ملک کی تمام فورسز (طاقتیں) ہوتی ہیں ان سے نہیں ڈرے، انگریزوں سے ٹکر لی۔ یہ کون لوگ ہیں؟ خبردار! میں ختم نبوت کے پاکیزہ اور مقدس مقصد کے لیے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے جوتے اٹھانے کو تیار ہوں لیکن ایسی حرکات سے ہمیں خوفزدہ نہیں کیا جا سکتا اور ہم اپنے موقف سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ اور پھر موجود ہزاروں لوگوں سے پوچھا، بتاؤ تم میرے ساتھ ہو یا ایسے لوگوں کے ساتھ جو اس مقدس کام میں رخنہ ڈال رہے ہیں؟ ہاتھ اٹھاؤ'' سب لوگوں نے ہاتھ اٹھائے اور مفتی صاحب نے مسئلہ ختم نبوت پر اسمبلی کی کارروائی سنائی اور جلسہ بخیر و خوبی دعا کے ساتھ ختم ہوا۔ مولانا مودودی نے جب شور دیکھا تو وہ اپنی مطبوعہ تقریر تقسیم کر کے سٹیج سے اٹھ کر چلے گئے۔ حالانکہ ان کو آخر تک بیٹھا رہنا چاہیے تھا تاکہ اپنے معتقدین کو قابو میں رکھتے یہ ان کی زبردست غلطی تھی کہ اپنے ورکروں کے شور شرابے میں چلے گئے۔ اگر حالات بے قابو ہو جاتے تو ان کو کون قابو میں لاتا۔

انگریزوں کے زمانہ میں جلسوں میں گڑبڑ ہوتی تو احرار رضا کار کسی کو پتہ بھی نہ لگنے دیتے اور فضا پرسکون ہو جاتی۔ احرار کے جلسوں میں عام طور پر لیگی، سرکاری یا تنخواہ دار لوگ ہی گڑبڑ کرتے اور منہ کی کھاتے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی آخری عمر میں اپنی جماعت کے ایسے ہی نوجوانوں اور لوگوں سے مایوس سے ہو چلے تھے۔ اسی قسم کے رویّے کا ایک مظاہرہ راقم نے اپنی آنکھوں سے ان کے جنازہ کے متعلق تنازعہ اور تدفین کے موقع پر دیکھا۔

مولانا ابوذر بخاری کی یاد میں لکھتے ہوئے انہی کی ایک تقریر کے سلسلے میں یہ ناخوشگوار تفصیل لکھنا پڑی کہ شاید مرزائیوں نے اس کو بڑھا چڑھا کر نہ لکھا ہو جیسا کہ مجھے علم ہوا ہے کہ اُن کے خلیفہ مرزا طاہر نے ایک تقریر میں جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے متعلق عجیب و غریب معلومات فراہم کر کے ان کو اور دیگر اہم واقعات و حادثات مثلاً ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی، شاہ فیصل کے قتل اور ضیاء الحق کی حادثاتی موت وغیرہ کو مرزائیت کی مخالفت کا عتاب قرار دیا ہے۔

مدحِ صحابہ میں بے مثال جدّ و جہد:

سردار احمد خاں پتافی نے ''تنظیم اہل سنت'' قائم کر کے ردّ رفض میں بڑا کام کیا تھا اور حضرت امیر شریعت سے

ہر سال اوسطاً ایک ماہ (اگر جیل میں نہ ہوں اور آزاد ہوں) ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ کے لیے رکھا تھا۔ سید ابوذر بخاری نے اس کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ تحریک چلائی کہ اپنی اولاد کے نام صحابۂ کرام، صحابیات اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں پر رکھے جائیں۔ چنانچہ اپنے بیٹوں کا نام محمد معاویہ اور محمد مغیرہ رکھا۔ ابومعاویہ کنیت اختیار کی اور اس کو بطور تحریک پورے ملک میں چلایا اور پھیلایا..... ''مستقبل'' اور ''مزدور'' نامی پرچہ واخبار تو شروع میں نکالے لیکن جنوری ۱۹۷۰ء سے پندرہ روزہ (بعد میں ماہنامہ) ''الاحرار'' نکال رہے تھے جو مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ آج کل اس کی ادارت واہتمام آپ کے بیٹے سید محمد معاویہ بخاری سلمہ اللہ (خلیفۂ مجاز حضرت سید نفیس شاہ صاحب) کر رہے ہیں۔ آپ کے قلم سے کان پارسی، مجمع المصادر العربیہ، الخطبات (خطبات جمعہ وعیدین عربی) احکام عید الاضحیٰ وعید الفطر، طلوعِ سحر (مجموعۂ تقاریر) مفکر احرار چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، مقدمات امیر شریعت، (سوانح) نکلیں جو اپنے موضوع پر بہت عمدہ ہیں۔ اسی طرح حضرت امیر شریعت کا کلام بنام ''سواطعُ الاِلٰہام'' شائع کیا جس کے شروع میں طویل مقدمہ لکھا۔ ان کتب کو ملا کر پچاس مختلف کتب ورسائل مختلف اوقات میں شائع کیے۔

امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ۱۹۶۱ء میں انہوں نے یوم معاویہ منانے کی تحریک شروع کی۔ مجھے یاد ہے کہ یوم معاویہ کے جلسہ پر پابندی لگی جس میں نظم کے مطابق مولانا محمد علی جالندھریؒ اور مولانا مفتی محمودؒ نے بھی تقریر کرنی تھی تو مجاہد ختم نبوت حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ بہت متفکر ہوئے کہ پاکستان میں کاتب الوحی، خال المومنین والمسلمین اور عظیم المرتبت صحابی، ایسے صحابی کہ جن کے ہاتھ پر حضرات حسنین اور سب زندہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیعت کی ان کا یوم منانا ممنوع ہے۔ یہ میری حضرت جالندھری سے خود سنی ہوئی بات ہے انہوں نے فرمایا کہ: ضلع ملتان کی آخری حد پر جلسہ رکھا جائے۔ پورا اہتمام کیا جائے اور اگر پابندی لگے تو وہی جلسہ ضلع منٹگمری (حال ساہی وال) کی حدود میں کیا جائے۔'' سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ کو حکومت نے گرفتار کر لیا۔ ملتان کے ایک قدیم احرار کارکن ملک عطاء اللہ نے ضمانت دی اور تقریباً مہینے بعد شاہ صاحب رہا ہوئے۔ یہاں ضمناً عرض کرتا چلوں کہ مولانا احمد رضا خان بریلوی مرحوم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہت شایان شان بات کی ہے۔ یہ ہمارے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے لیے دلیل نہیں۔ وہ اس اور اس جیسی ہزار دلیلوں کے بغیر بھی جلیل القدر صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اس لیے لکھا کہ فی زمانہ اکثر بریلوی علماء حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بہ عزت نام لینے سے گھبراتے اور کتراتے ہیں۔ اُنھیں قرآن وحدیث کا نہیں تو کم از کم فاضل بریلوی کے فتویٰ کا لحاظ تو رکھنا چاہیے۔

مولانا سید ابوذر بخاری نظم ونثر، تقریر وتحریر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چھے سات گھنٹے کسی خالص علمی موضوع پر مربوط و مدلّل تقریر کر لینا آپ کے لیے بہت آسان تھا۔ بوجوہ تحریری کام کم کر سکے، غزل، نظم، نعت، منقبت میں بھی کمال حاصل تھا، ان کے فنی اور ادبی محاسن سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے حضرت سید احمد شہید پر ایک طویل نظم ''مجدّد اعظم'' لکھی۔ جس میں شہدائے بالاکوٹ کو عجیب بلیغ انداز میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم ان کی شعری کاوشوں کا شاہکار ہے۔

حضرت مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ اب وہاں جا چکے جہاں ہم سب کو جانا ہے اور جہاں سے لوٹ کر کبھی کوئی نہیں آیا۔ اُن کا عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم، صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت، علمی وادبی اور تحریکی وتبلیغی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ وہ ناقابلِ فراموش شخصیت تھے۔